R. No. 21505 | Regd. No. 622

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 29
Telegrams
"ANJUMAN"

جلد ۲۱ ۔ شمارہ ۱۵ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر سید عابد حسین

جمہوریت میں فرد کی آزادی

جمہوریت حکومت کے اس طریقہ کا نام ہے جسے ہم بول چال میں عوامی حکومت کہتے ہیں۔ اس سے مراد ہے ایسی حکومت جس میں کوئی ایک شخص یا چند آدمی اپنی من مانی نہ کرتے رہیں، بلکہ دیس کے سب رہنے والے مل کر اپنے نمائندوں کو ایک مدت کے لئے چنتے ہیں اور وہ قانون بنائیں اور راج پاٹ کی نگرانی کریں۔ عوامی حکومت دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جس میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہو سکتی ہے کہ قانون کے دائرے کے اندر جس طرح چاہے اپنے عقیدے اور ضمیر کی روشنی میں زندگی بسر کرے۔ جہاں چاہے رہے، جو پیشہ چاہے اختیار کرے۔ دوسری وہ جس میں فرد ریاست کے بنائے ہوئے قانون کے جال میں اس طرح جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ اس کی آزادی بہت محدود ہو جاتی ہے۔ جہاں حکومت کہے رہنا پڑتا ہے اور جو کام وہ بتائے کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو دونوں قسم کی حکومتیں جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں مگر دنیا کے نوے فی صدی لوگ صرف پہلی قسم کی حکومت کو جس میں فرد کو پوری پوری آزادی ہوتی ہے جمہوریت مانتے ہیں دوسری حکومت کو کلی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی ایسی حکومت جو سماجی زندگی کے کل شعبوں میں دخل دیتی ہے اور فرد کے عمل پر بلکہ اس کے خیال یا کم سے کم اظہار خیال پر بھی پابندی لگاتی ہے۔ آج کی بات چیت میں ہم جمہوریت کا لفظ اسی حکومت کے لئے استعمال کر رہے ہیں جو فرد کو قانون کے دائرے کے اندر خیال، قول اور عمل کی آزادی دیتی ہے۔

آیئے اب ذرا یہ دیکھیں کہ جمہوریت کی داغ بیل شروع میں کس طرح پڑی اور پھر جمہوری ریاست کی پوری عمارت جس شکل میں ہم آج دیکھ رہے ہیں رفتہ رفتہ منزل بہ منزل کس طرح بن کر کھڑی ہو گئی۔

انسانی سماج کے بڑھنے کی تاریخ کو پڑھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ملکوں میں جن میں ہمارا ہندوستان بھی شامل ہے۔ جب یہاں لوگ مل کر بستیوں میں رہنے لگے تو ہر ایک گاؤں میں لوگوں نے آپس کے جھگڑوں کو نبٹانے اور گاؤں کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے لئے پنچایتیں بنائیں انہی پنچایتوں کو جمہوری حکومت کی پہلی منزل سمجھنا چاہیئے۔ دوسری منزل دو ڈھائی ہزار سال پہلے یورپ کی شہری ریاستوں یعنی یونان کی ریاست ایتھنس اور پھر اٹلی کی ریاست روما میں نظر آتی ہے جہاں غلاموں کو چھوڑ کر شہر کے سارے مرد اکٹھے ہو سکتے تھے اور کچھ لوگوں کو چن کر حکومت کا کاروبار ان کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس کے بعد جب یونان اور روما کا سورج ڈوب گیا تو سارے بیچ کے زمانے میں سیاست کی دنیا میں اندھیرا چھایا رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک یورپ میں جمہوری حکومت کی روشنی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ جاگیرداری عہد تھا جس میں چھوٹے بڑے جاگیردار بڑے بادشاہ کے ماتحت کہلاتے تھے مگر در اصل اپنے اپنے علاقے میں خود مختار تھے۔ رعایا کو اپنا غلام سمجھتے اور اس پر من مانی حکومت کرتے تھے۔ چودھویں صدی میں اٹلی کے بعض شہروں نے جمہوری ریاستیں بنا لیں جیسی سیکڑوں سال پہلے یونان اور روما میں بنی تھیں۔ سوئزرلینڈ میں دیہاتی علاقے میں کسانوں اور دستکاروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی جمہوری حکومتیں

قائم کرلیں۔ آگے چل کر ہالینڈ اور جرمنی کے تجارتی مرکزوں میں ہر قسم کی شہری ریاستوں کی بنیاد پڑی۔

سولھویں صدی میں جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آکر لوگ بادشاہ کے سائے میں پناہ لینے لگے۔ اور اس کی حکومت کو مضبوط کرنے لگے تاکہ جاگیرداری کا زور ٹوٹے اس سیلاب میں جاگیرداروں کی حکومت شہری ریاستیں بھی بہہ گئی تھیں۔ اور سب ملکوں میں بادشاہ کا ڈنکا بجنے لگا۔ اب یہ دلچسپ کہانی سنیئے کہ بادشاہوں نے کس طرح آپ ہی اپنی حکومت کی بربادی کا سامان کرکے جمہوریت کے لئے راستہ صاف کردیا۔ اکثر ملکوں میں بادشاہ، امراء اور تاجروں سے ملکی امور میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ انگلستان میں پارلیمنٹ جس کے ممبران ان دنوں زیادہ تر امراء اور تاجر ہوا کرتے تھے۔ محصول وصول کرنے اور اس کو خرچ کرنے کے معاملے میں بادشاہ پر پابندیاں بھی لگا سکتی تھی۔ مگر عام طور پر حکومت کے سارے اختیارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے اور ان میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ کو حکومت کا خداداد حق حاصل ہے اسی طرح جیسے رومی کلیسا اور اس کے سردار پوپ کو روحانی ہدایت اور رہنمائی کا۔ چنانچہ بادشاہ ایک حد تک کلیسا کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ سولھویں صدی کے وسط میں جب بعض ملکوں میں اصلاح مذہب کی تحریک نے فرد کو کلیسائی تقلید سے آزاد کرکے یہ حق دے دیا کہ بائبل کی تعلیم کی روشنی میں اپنے عقیدہ و عمل کی راہ خود متعین کرے تو پروٹسٹنٹ جماعتوں میں مذہبی تنظیم کا کام افراد کے آزاد گروپ اس کے مشورے سے کرنے لگے۔ بادشاہ نے کلیسا اور پوپ کے اقتدار کی بیخ کنی کرنے کے اس تحریک کی حمایت کی مگر یہ نہ سمجھے کہ وہ خود اپنے اقتدار کی بھی جڑیں کھود رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے سوچا کہ اگر پوپ کو خدا کی طرف سے رہنمائی کا حق نہیں ملا ہے تو بادشاہ کو بھی حکومت کا خداداد حق حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم خود مل کر مذہبی امور کی تنظیم کرسکتے ہیں تو آخر سیاسی اور معاشی زندگی کی کیوں نہیں کرسکتے۔ غرض جس طرح پادریوں کی ذہنی حکومت کے خلاف اصلاح مذہب کی تحریک اٹھی تھی اسی طرح بادشاہوں کی دنیاوی حکومت کے خلاف جمہوریت کی تحریکیں اٹھنے لگیں۔ ان کے خداداد حقوق کا جو نظریہ چلا آتا تھا اس کے توڑ کے لئے قدرتی انسانی حقوق کا نظریہ قائم کیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں امریکہ نے جو انگلستان کی ایک کالونی تھی سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑائی لڑی تو لوگوں میں اپنے مقصد پر یقین و اعتبار اور اخلاقی ورس پیدا کرنے کے لئے قدرتی انسانی حقوق اور جمہوری اقتدار اعلیٰ کے نظریوں سے کام لیا گیا۔ امریکی انقلاب سے متاثر ہوکر فرانس میں "روسو" نے "عمرانی معاہدے" کا نظریہ مرتب کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہر انسان کو قدرت نے آزاد پیدا کیا ہے۔ بادشاہوں کو حکومت کا حق لوگوں نے ایک معاہدے کے ذریعہ سے کچھ شرطوں پر دیا ہے جن سے ان کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ اگر بادشاہ ان شرطوں کو پورا نہ کریں تو جمہور کو ان کے خلاف بغاوت کرکے اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا حق حاصل ہے۔ اس طرح کے تصورات نے انقلاب فرانس کے لئے جس کے اور بھی کئی سیاسی اور معاشی محرک بھی تھے اخلاقی جواز پیدا کردیا۔ امریکہ اور فرانس کی ری پبلک کا قائم ہونا جمہوریت کی تیسری منزل تھی، جس میں بادشاہ یا امراء کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ عوام کے نمائندے نہ صرف ریاست کے قوانین بناتے تھے بلکہ چند سال کے لئے صدر ریاست کا انتخاب بھی کرتے تھے اور وہ وزیروں کا تقرر کرتا تھا جو حکومت کا کام انجام دیتے تھے۔ انگلستان نے بادشاہ کے منصب کو برائے نام قائم رکھا۔ لیکن جمہوریت کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی کابینہ کی حکومت کا طریقہ نکالا جو پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس طرح عوام کی نمائندہ پارلیمنٹ نہ صرف قانون سازی کا کام کرتی ہے بلکہ حکومت کے روزمرہ کے کاروبار پر بھی نگرانی رکھتی ہے۔ اس کی تقلید ایک حد تک اور ملکوں میں بھی کی گئی۔ جمہوریت کی ترقی کی چوتھی منزل یہ تھی کہ انیسویں صدی کے وسط میں آئین ساز مجلسوں کے انتخاب میں رائے دینے کا حق صرف اس طبقے کو تھا جس کے پاس املاک تھیں۔ صدی کے آخر میں انگلستان میں یہ حق ملک کے بالغ مردوں کو اور آگے چل کر عورتوں کو بھی مل گیا۔ آج ہندوستان اور بہت سی دوسری جمہوریتوں میں ووٹ کا حق بالغ مردوں اور عورتوں کو حاصل ہے۔ مگر بعض ملکوں میں یہ حق ابھی تک مردوں ہی تک محدود ہے۔

(باقی صفحہ ۷ پر)

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط کتابت اور ارسال زر
"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ" کے پتہ پر فرمایئے

بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے جس کے امکانات کا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے میں ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور بعض خطوط کا جواب بروقت نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط
"جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ" کے پتے پر بھیجئے۔

ہماری زبان

۱۵ر اپریل ۱۹۶۳ء

ہندی کے ساتھ انگریزی

۱۳ر اپریل کو پارلیمنٹ میں سرکاری زبانوں کا جو قانون پیش ہوا، اُس کی اہم دفعات یہ ہیں :

(۱) دستور کے نفاذ سے پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی ہندی کے علاوہ انگریزی مرکز کے ان تمام سرکاری کاموں کے لئے استعمال کی جاتی رہے گی جن کے لئے وہ اب تک استعمال ہوتی رہی ہے۔ ان کاموں میں پارلیمنٹ کا کاروبار بھی شامل ہے۔

(۲) ۲۶ر جنوری ۱۹۷۵ء کے بعد صدر ایک کمیٹی بنانے کا مجاز ہوگا جس میں بیس ممبر لوک سبھا کے اور دس ممبر راج سبھا کے ہوں گے۔ یہ کمیٹی مرکز کے سرکاری مقاصد کے لئے ہندی کے استعمال کا جائزہ لے گی اور صدر کی خدمت میں سفارشات کے ساتھ رپورٹ پیش کرے گی۔ صدر ان سفارشات کے مطابق ہدایات جاری کرے گا۔

(۳) مرکز کے ایکٹ، آرڈی ننس، حکم، قانون، ریگولیشن اور بائی لا کا ہندی ترجمہ جو صدر کی جانب سے گزٹ میں شائع ہوگا مصدقہ متن مانا جائے گا۔

(۴) انگریزی میں جو بل پارلیمنٹ میں پیش ہوں گے، اُن کے ساتھ مصدقہ ہندی ترجمے بھی ہوں گے۔ اسی طرح اُن ریاستی مجالس قانون ساز میں جہاں ہندی کے علاوہ کسی دوسری ہندستانی زبان میں کاروبار ہوتا ہے، ہندی ترجمہ ساتھ ہوگا۔

(۵) صدر کی اجازت کے بعد کسی ریاست کا گورنر اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ اپنے فیصلوں اور ہدایات کے لئے ریاستی ہائی کورٹ ہندی یا ریاست کی سرکاری زبان کو استعمال کرے۔ لیکن فیصلہ کے ساتھ ایک مصدقہ انگریزی ترجمہ بھی ہوگا۔

اگر ان دفعات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ہندی والے اس قدر چراغ پا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۳ر اپریل کو پارلیمنٹ میں جو ہنگامہ رہا اور جس کی وجہ سے تین ممبروں کو معطل کیا گیا اُسے کسی طرح سراہا نہیں جا سکتا۔ اس ہنگامہ سے نہ صرف پارلیمنٹ کے وقار کو ٹھیس پہنچی بلکہ ان لوگوں کے بھی جذبات مجروح ہوئے جو قومی یکجہتی کے لئے ابھی کچھ عرصے تک انگریزی کو شریک زبان کی حیثیت سے چلانا چاہتے ہیں۔ جن لوگوں نے پارلیمنٹ کے باہر مظاہرہ کیا اور پارلیمنٹ کے اندر شور مچایا انھوں نے ہندی اور ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ مرکز کی سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کی پوزیشن مسلّم ہو گئی۔ اب اگر کچھ عرصے تک سہولت کے لئے انگریزی کی بھی سرکاری حیثیت باقی رہتی ہے تو اس میں ہندی کا اپمان کہاں سے نکل آیا۔ جمہوریت رواداری کا تقاضا کرتی ہے، دوسرے کو سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے، صرف اپنی بات پر اڑے رہنے اور دوسرے کے جذبات کو نظر انداز کرتے رہنے سے جمہوریت کا فروغ نہیں ہوتا۔

سیر بین

خبر ملی ہے کہ ناگ پور کے قریب ایک ریسرچ کا مرکز قائم ہونے والا ہے جس میں پان پر تحقیق کی جائے گی اور اس کے پتوں میں جو خرابیاں یا بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اُن کے دور کرنے کے لئے تدابیر سوچی جائیں گی۔

سبحان اللہ برسوں کے بعد ایسی مُفرّحِ قلب بات سننے میں آئی۔ پچھلے سال جب پان کو پالا مار گیا تھا تو اس دیار میں ہر صاحب ذوق کے چہرے پر زردی دکھائی دیتی تھی۔ شکر ہے کہ اب ہمارے سائنس داں بھی صاحب ذوق ہوتے جاتے ہیں، انھیں یہ احساس ہو چلا ہے کہ وہ بھی اب پان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

اُردو اور پان کا رشتہ جسم اور روح کا رشتہ ہے۔ ہم نے بہتیرے فرزندانِ اردو کو پان کی بُرائی کرتے دیکھا ہے، مگر ہر وقت گونہ چبانے، بھلا بھلا منہ سے دُھواں چھوڑنے اور سگریٹ پر سگریٹ جلانے پر ہم تا ٹک، دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق ہو جاتے ہیں تو ان حضرات کو اس برگِ سبز پر اعتراض کیوں ہو جسے تحفۂ درویش کہا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برگِ سبز سے مُراد بھنگ ہے جسے سبزی بھی کہتے ہیں، مگر ہمیں اصرار ہے کہ ابتدا میں اس سے کچھ بھی مُراد رہا ہو، آج کے درویش تو برگِ سبز سے پان مُراد لیتے ہیں۔

اگر آپ جنوبی ہندستان سے واقف ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ وہاں پان کے پتے لوازمات کے ساتھ خالی ہی رکھ دئے جاتے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ ان کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ ہاں آپکے سلوک سے آپکا ظرف ضرور کُھل جائے گا۔ یقیناً یہی پان کا پتا درویش تحفے میں دیتے ہوں گے۔

شوکت تھانوی کے متعلق کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سودیشی ریل یا شیش محل کی وجہ سے اردو ادب میں زندہ جاوید رہیں گے، حالانکہ دراصل ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پانوں سے اپنے عشق کا ذکر اسی والہانہ انداز سے کیا ہے جس انداز سے دلّی جنّت کا، کمیونسٹ مارکس کا، سرکاری افسر سول سروس کے نظام کا، بوڑھے بچپن کا، ہندستانی خواتین اپنی نالائق اولاد کا، عاشق اپنے محبوب کا اور طالب علم اپنی شرارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی لکھنؤ کے بنگلہ پانوں پر فدا ہیں، بلکہ مہوبے کے پانوں کی خشکی بھی اُن کی نظر میں کھٹکی ہے۔ غالب نے محبوب کی نگاہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ مہوبے کے پان پر بھی صادق آتا ہے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

پانوں کی گلوری سے گھر والی کے سُگھڑاپے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مہدی افادی کے نزدیک کسی کتاب کی سب سے بڑی تعریف یہی تھی کہ صاف ہاتھوں میں ہو، لیکن صاف ہاتھ تو دراصل اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ ان میں گلوریاں نظر آئیں۔

خدا ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی کا بھلا کرے۔ اُنھوں نے ملتان کی ایک ادبی خصوصیت اپنے ایک لیکچر میں بیان کی جس سے ہم بے خبر تھے۔ ملتان کے ساتھ گرد و گرما، گدا و گورستان کا ہی تصور وابستہ ہے حالانکہ ایک زمانے میں اس کی گلیوں میں پان کی پیک کا اتنا کیچڑ ہوتا تھا کہ لوگوں کے پیر پھسل پھسل جاتے تھے۔ خیر یہ تو بد مذاقی تھی۔ اہلِ ذوق اس طرح سڑکوں پر خون تھوکتے نہیں پھرتے وہ کام و دہن کی ہر آزمائش میں پورے اُترتے ہیں۔ سائنس داں پان کی ساری بیماریاں دور کر دیں، پھر دیکھئے ہندستان کا تیسرا پنج سالہ پلان کتنا کامیاب ہوتا ہے۔

حکومت ہماچل پردیش کی اُردو دوستی

حکومت ہماچل پردیش نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں اُردو کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ ہماچل پردیش کی سرکار نے نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے یہ حوصلہ افزا اور قابلِ تحسین قدم اُٹھایا ہے۔ اسی برس فیصلے کو عملی شکل دی جارہی ہے حکومت نے تمام اسکولوں میں اُردو مدرسوں کا انتظام کردیا ہے اور تمام ریاستی پبلشروں سے نصاب کی کتابوں کے نمونے طلب کیے ہیں۔ ایک کمیٹی ان میں سے موزوں کتابیں منظور کرے گی، جو آئندہ اسکولوں میں رائج کردی جائیں گی۔

اُردو دوستوں کو حکومتِ ہماچل پردیش کے فیصلے کی داد دینے کے علاوہ پنجاب سرکار پر بھی اسی قسم کا فیصلہ کرنے کے لئے زور دینا چاہیئے۔ (سورج تنویر)

اُردو کتاب کی اشاعت کیلئے حکومت مغربی بنگال کی اعانت

شری شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تالیف "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات" کی طباعت و اشاعت کے لئے حکومت مغربی بنگال نے دو ہزار چار سو اڑسٹھ (۲۴۶۸) روپے کی رقم منظور کی ہے۔ کتاب زیرِ طبع ہے اور مولف کے بیان کے مطابق جون ۱۹۶۳ء تک شایع ہوجائے گی۔

حلقہ فکر و فن (پٹنہ)

"حلقۂ فکر و فن" عظیم آباد کا ایک ادبی رسالہ ہے، جس نے اپنی استطاعت کے مطابق نئی تصانیف کی اشاعت کا کام بھی اپنے لائحۂ عمل میں رکھا ہے۔ چنانچہ اس ادارے سے جناب نسیم اختر پالوی کا ایک ڈرامہ کتابی شکل میں شایع کیا جارہا ہے، جو ڈاکٹر اختر اورینوی کے تعارف اور پروفیسر جمیل مظہری کے پیش لفظ کے ساتھ شایع ہورہا ہے۔

ربکوی میں "تاج لائبریری" کا قیام

۱۰ مارچ کو ربکوی (ضلع بیجاپور) میں "تاج لائبریری" کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مرزا نصیر الدین بیگ نے صدارت فرمائی۔ صدر لائبریری نے خطبۂ استقبالیہ کے بعد شام راؤ دالوٹے ایڈیٹر نو ہند (جمکھنڈی) سے درخواست کی کہ وہ لائبریری کی افتتاح فرمائیں۔ جناب وہاب نے "اُردو تعلیم در زندگی" جناب ایس، انیس قادری نے "لائبریری کی ضرورت" شریمتی کملا بائی ایس گھنٹی نے "عورت اور تعلیم" جناب پٹیل نے "تعلیم کی ضرورت" کے زیرِ عنوان مقالے پیش کئے۔ جناب ڈی مرگیا سوامی ایڈیٹر سنت وانی (ربکوی) اور جناب شام راؤ دالوٹے ایڈیٹر نو ہند (جمکھنڈی) نے "اُردو زبان کی اہمیت" پر تقریریں کیں۔

سروجنی نائیڈو کی شخصیت اور شاعری کو خراجِ عقیدت

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کی پندرھویں برسی کے موقع پر اردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس ۳۱ رمارچ کو اُردو ہال میں منعقد ہوا پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم۔ اے۔ ایل۔ بی نے جلسہ کی صدارت کی۔ محترمہ منیزہ بانو کاؤس جی نے اپنے دلچسپ اور معلوماتی مضمون کو پڑھ کر کہا کہ "سروجنی دیوی کو فطرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ زبان اور قلم دونوں پر قدرت عطا فرمائی تھی اور دل و دماغ دونوں کی برکتیں ان کی ذات میں جمع کردی تھیں۔ اشعار میں سوز و گداز، روانی اور جوش اور زبان کی شستگی اور اثر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ معمولی سے معمولی موضوعات کو ایک حسین پیرائے میں پیش کرنا سروجنی دیوی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔" محترمہ منیزہ بانو نے کہا کہ "حیدرآباد ان کے لئے ایک شہر نہیں بلکہ ایک گھرانہ تھا جس میں وہ سب کو جانتی تھیں اور سب پر مہربانی کی نظریں رکھتی تھیں اور سب کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتی تھیں۔"

سری نواس لاہوٹی نے "سروجنی نائیڈو کی شخصیت" پر اپنا دلچسپ مضمون پیش کرتے ہوئے بتایا کہ "سروجنی دیوی اپنے زمانے کی بہت بڑی لیڈر اور اپنی قوم کی محبوب اور اپنے رفقاء کا بہت بڑا سہارا تھیں۔ ان کا وجود ہماری تہذیب و تمدن کا ایک بیش بہا سرمایہ تھا جسے حیدرآباد نے ہندوستان کو اور ہندوستان نے دوسرے متمدن ممالک کو دیا۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اپنی صدارتی تقریر میں سروجنی دیوی کی شخصیت کو قومی اتحاد کا ایک جامع مظہر قرار دیتے ہوئے کہا کہ "ان کے انقلابی افکار و کردار نے ہندوستان کی نئی نسل کو متاثر اور میدانِ عمل میں سرگرمِ عمل کیا۔" پروفیسر شروانی نے اس بات پر تاسف کیا کہ سروجنی دیوی کا مکان جو ایک زمانے میں حیدرآباد کا "جمالیاتی مرکز" بنا ہوا تھا آج وہ ایک سینے میں تبدیل ہوگیا ہے۔" (وقار خلیل)

رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

مارچ کے مہینے سے ہر ہفتہ صولت لائبریری میں انسٹیٹیوٹ میں لکچروں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ پہلا لکچر جناب حامد علی خاں نے "عرب و ہند کے تعلقات قبل اسلام" پر دیا۔ دوسرا لکچر ڈاکٹر عبد العلیم نامی (بمبئی) کا "اردو ڈراما اور تھیٹر کی تاریخ" کے عنوان سے اور تیسرا لکچر عابد رضا بیدار نے "میر کا مطالعہ" پیش کیا۔

آفتاب شمسی

قوتِ تخیل

(۱)

تیری کاوش سے قوتِ تخیل!
ذہن میں بس رہی ہیں تصویریں
تیرگیٔ غم کی بڑھ رہی ہے مگر
تو بکھیرے ہوئے ہے تنویریں

(۲)

تو ہی وہ اک اٹل حقیقت ہے
جو حوادث کا منہ چڑاتی ہے
غمِ دوراں کے سخت پنجے سے
تو ہی اکثر ہمیں بچاتی ہے

(۳)

جب کبھی حادثوں کے ظالم ہاتھ
ذہن و دل کو تباہ کرتے ہیں
تیرے ہی بل پہ قوتِ تخیل
ہم غموں سے نباہ کرتے ہیں

(۴)

باوجودِ وفورِ ظلمتِ غم
تو دکھاتی ہے نورِ مستقبل
لاکھ مایوس اور ملول ہوں ہم
تو سجاتی ہے اک نئی محفل

(۵)

ہو کے عاجز کبھی مصائب سے
خودکشی کی جو دل میں آتی ہے
تو ہی ان کش مکش کے لمحوں میں
نغمۂ زیست گنگناتی ہے

(۶)

قوتِ فکر، قوتِ تخیل
بس انہیں سے ہے شعر میں الہام
اور جو یہ نہیں تو اے ہمدم
شاعری ایک کوششِ ناکام

رئیس اجمیری

سوال

حیاتِ نو کے مبلغ سوال کرتے ہیں
کہ تم نے امن و اخوت کے گیت بھی گائے
تمہیں نے مہر و محبت کو زرنگار کیا
سماج داد کے زریں اصول اپنائے
مگر یہ کیا کہ طریقِ وفا بدل ڈالا!!
تمہیں نے رشتۂ الفت کو داغدار کیا
تمہیں نے ہاتھ بڑھایا تھا دوستی کے لئے
تمہیں نے بڑھ کے بھلا کیوں آج وار کیا

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ دلبری کیا ہے؟
تمہیں کہو کہ یہ طرزِ ستمگری کیا ہے؟

غزلیں

سید حرمت الاکرام

رات کی شمع سا بستر تنہا
دل جلایا ہے تا سحر تنہا
آفتِ جاں ہے وضعِ جمہوری
وقت کی راہ سے گذر تنہا
حادثوں نے ہمیں کوتا کا ہے
تھے ہمیں ایک دیدہ ور تنہا
کچھ نہیں تو رفاقتِ غم تھی
زندگی کس نے کی بسر تنہا؟
قتل گاہِ وفا میں خدائی
حرمت آئے ہمیں نظر تنہا

کرشن موہن

اک بتِ آشنا نے مارا ہے
درد بن کر دوا نے مارا ہے
جور سہتیں کہ لطفِ رنگیں ہو
تیری اک اک ادا نے مارا ہے
ابتدائے وفا کا ہے کے قریب
انتہائے جفا نے مارا ہے
اپنی کرنی کا پھل ہے کیوں سمجھیں
غفلتِ رہنما نے مارا ہے
کرشن موہن کو دارِ فانی میں
آرزوئے بقا نے مارا ہے

وحید مرزا

کوئی مونس بھی ہے ہمدم بھی ہے دمساز بھی ہے
انجمن والوں میں اب تو کوئی ہمراز بھی ہے
وہ بھی دن تھے جبری آواز تھی تنہا تنہا
میری آواز میں اب بزم کی آواز بھی ہے
شمع کی لو پہ نچھاور ہے پتنگوں کا ہجوم
عشق دیوانہ بھی مجنوں بھی ہے جانباز بھی ہے
راستے کھل گئے تاروں کی گزرگاہوں تک
اوجِ زہرہ سے پرے منزلِ پرواز بھی ہے

چندر پرکاش شاد

دریچہ کھل گیا ہے آسماں کا
چلو وقت آگیا ہے امتحاں کا
جفا کو بھی دیا ہے رتبہ خاص
زمانہ ہے تمنائے جواں کا
گھٹا سی کچھ امڈی آرہی ہے
کہ سایہ ہے کسی خوابِ گراں کا
کچھ اپنے حال کا بھی جائزہ لو
یہ قصہ چھیڑ رکھا ہے کہاں کا

خاور جبل پوری

تانتیا ٹوپے

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے مشہور ہیرو تانتیا ٹوپے جس کو ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو بغاوت کے جرم میں پھانسی دی گئی۔ تانتیا ٹوپے کا نام رام چندر پانڈو رنگ تھا۔ مگر عرف عام میں تانتیا ٹوپے مشہور ہے۔ اس کے باپ، باجی راؤ پیشوا کے پروردہ یافتہ اور جنگ آزادی کے مشہور مجاہد "نانا صاحب" کا جگری دوست اور سچا رفیق تھا۔

تانتیا ٹوپے، بڑا دلیر، بہادر، شجاع اور ہمیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھنے والا مرد میدان تھا۔ اُس نے فنون سپہ گری سے ناواقف اور کم تعداد فوج کے ساتھ انگریزوں کی تربیت یافتہ فوج کا آخر دم تک مقابلہ کیا اور کئی مرتبہ اپنے دشمنوں کو زک پہنچائی۔

دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے اس کی راہ میں کانٹے بچھائے، کچھ برادران وطن نے کھلی مخالفت کو جزو ایمان سمجھا۔ مگر اس نے کسی کی پروا نہیں کی اور ہمیشہ اپنے کام میں نہایت مستعدی سے مصروف رہ کر جنگ آزادی کے علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

اسی دوران میں اس کی فوج کا زیادہ حصہ، دشمن کے سخت مقابلے کی تاب نہ لاکر ہمت ہار چکا تھا۔ بہت سے سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور کئی قابل اعتماد فوجی افسر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے تھے۔

آلات جنگ چھین لئے جانے، مدتوں سے جمع کیا ہوا خزانہ لٹ جانے اور قدم قدم پر ناکامیوں کے روڑے اٹک جانے پر بھی اس کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہوئی اور وہ ہمیشہ ایک جانباز سپاہی کی طرح میدان کارزار میں ڈٹا رہا۔

جون ۱۸۵۸ء میں گوالیار کی فوج کو ریاست کی غلامی سے چھڑا کر اپنی فوج میں ملانا چاہا مگر مہاراجہ سندھیا کے تدبر نے بہت دن تک اپنی مخالف فوج کو باغی فوج سے ملنے نہیں دیا تو خود تانتیا ٹوپے نے فوج کی کمانڈ سنبھال کر انگریز فوج کو شکست فاش دے دی، اور دشمنوں کے دل پر اپنی جواں مردی کا سکہ بٹھا دیا۔

اس کے بعد برٹش فوج کے جنرل "کالرین کیمپ ویل" نے تانتیا ٹوپے کی سرکوبی کا بیڑا اُٹھایا۔ نانا اور تانتیا کی متحدہ فوج سے انگریز فوج کا کان پور کے قریب سخت مقابلہ ہوا۔ آزاد فوج اس مقابلے کی تاب نہ لاکر پسپا ہو گئی مگر تانتیا اپنی فوج کو بچا کر وہاں سے نکال لے گیا۔

انہی دنوں جھانسی میں بھی بغاوت پھیل گئی۔ کانپور کالپی اور جھانسی۔ باغی فوج کے مستقر بن گئے تو انگریزی فوج کے جنرل ہیوروز نے جھانسی پر حملہ کر دیا۔

اس وقت تانتیا راجہ چرکھاری سے مصروف جنگ تھا وہ فوراً جھانسی کی رانی کو مدد دینے کے لئے روانہ ہوا مگر دشمن کی فوج نے اس کا راستہ روک لیا، اور جھانسی کی رانی انگریز فوج سے شکست کھا کر کالپی چلی گئی۔ لیکن انگریزوں نے کالپی پر بھی حملہ کر کے اسے کالپی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد تانتیا ٹوپے کے مشورے سے لکشمی بائی رانی جھانسی اور راؤ صاحب نے گوالیار کا رُخ کیا۔ تانتیا ٹوپے پہلے ہی سے گوالیار پہنچ کر وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو اپنا طرفدار بنا چکا تھا اس لئے رانی جھانسی نے گوالیار پر بہت آسانی سے قبضہ کر لیا۔

مہاراجہ سندھیا نے فرار ہو کر آگرے میں انگریزوں کی پناہ لی اور مہارانی گوالیار (بائی جا بائی) نے نرور گڑھ قلعے میں آکر خود کو محفوظ کیا۔

جون ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے گوالیار پر حملہ کر کے رانی جھانسی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

گوالیار کی عنان حکومت دشمن کے قبضے میں پہنچ جانے سے تانتیا ٹوپے علاپور جا کر انگریزی فوج پر حملہ آور ہوا اور وہاں سے بھی شکست پا کر بچی ہوئی فوج کو راجپوتانہ لے گیا۔ لیکن انگریز فوج نے اسے جے پور جانے سے راستہ ہی میں روک لیا تو وہ ٹونک چلا گیا اور وہاں کی فوج کو اپنا ہم خیال اور ساتھی بنا لیا۔

پے در پے شکستوں سے بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی دھن میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ جب جھالرا پاٹن پہنچا تو وہاں کے راجہ نے پانچ لاکھ روپیہ اسے نذر کیا پھر چندیری، مانگرول، اسیر گڑھ، کھرگون، بڑودہ، اودے پور بانس واڑہ، میواڑ، بھیل واڑہ، پرتاب گڑھ وغیرہ مقامات پر دشمنوں کے نظر سے بچتا ہوا مارا مارا پھرتا رہا۔ انگریز فوج ہر جگہ اس کا تعاقب کرتی رہی اور کہیں کبھی اس کے قدم جمنے نہیں دئے۔ پرتاب گڑھ کے مقابلے میں بھی وہ خود کو انگریزوں سے بچا کر مندسور چلا گیا۔

بالآخر ۱۸۵۹ء میں پاڑوں کے راجہ مان سنگھ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ مان سنگھ اپنے آباء کے کھوئے ہوئے وقار اور ہاتھ سے نکلی ہوئی ریاست نرور گڑھ جو ان دنوں سندھیا کے قبضہ اقتدار میں آگئی تھی دوبارہ حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر انگریزوں نے اس کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا، اور پوہری کا علاقہ اور قلعہ جس پر مان سنگھ نے قبضہ کر لیا تھا واپس لے کر اسے پاڑوں کے جنگلوں میں دھکیل دیا۔

تانتیا ٹوپے کو دو سال کی مسلسل ناکامیوں نے برٹش فوج کے مقابلے میں فتح نہ پانے کا یقین دلا دیا تھا کیونکہ کالپی اور گوالیار جیسے اہم مورچوں پر قبضہ کر کے بھی اسے کوئی فائدہ نہیں

ہوا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور بیلسہ جاکر مرہٹوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرکے ایک آخری اور فیصلہ کن حملہ کرنے کا تہیہ کرلیا لیکن یہاں بھی اس کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا اس لئے مجبور ہوکر بے نیل و مرام واپس آکر پاڑون کے جنگل میں مان سنگھ سے ملا۔

مان سنگھ نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور تانتیا نے اس کی دوستی پر بھروسہ کرکے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

دس وقت کرنل میڈی چاروں طرف سے پاڑون کا جنگل گھیرے ہوئے تھا۔ مان سنگھ آوارہ گردی سے تنگ آکر مصلحتاً کرنل میڈی کے کیمپ میں حاضر ہوگیا اور جاں بخشی کے وعدے پر انگریزوں کی وفاداری کا حلف اٹھالیا۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد پر دوستی کے پاکیزہ جذبے کو قربان کرکے تانتیا ٹوپے کو انگریزوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کرنل میڈی سے کرنے کے بعد رات میں تانتیا ٹوپے سے جنگل میں جاکر ملا۔

تانتیا ٹوپے کئی دن کا تھکا ہارا تھا۔ مان سنگھ کو اپنا محافظ، مخلص اور ہمدرد سمجھ کر آرام سے سوگیا۔

مان سنگھ نے جنگل میں پہلے سے چھپائے ہوئے سپاہیوں کو اشارے سے بلاکر بے خبر سوئے ہوئے تانتیا ٹوپے کو گرفتار کرکے انگریزوں کے سپرد کردیا۔ تانتیا کی گرفتاری کی خبر پاکر اس کے ساتھی اپنے محبوب لیڈر کو مصیبت میں مبتلا چھوڑ کر فرار ہوگئے ...

۱۵ اپریل ۱۸۵۹ء کو اس کے خلاف "انگریز حکومت سے بغاوت" کا مقدمہ سیپری (SIPRI) مقام پر فوجی عدالت میں سماعت ہوا۔

الزام یہ تھا کہ اس نے مسلسل دو برس تک گوالیار اور جھانسی میں بغاوت کی تحریک پھیلا کر امن عامہ کو برباد کردیا ہے۔

تانتیا ٹوپے نے اپنی صفائی میں منجملہ دوسری دلیلوں کے یہ بھی کہا کہ جب میں خود کو برٹش گورنمنٹ کی رعیت ہی نہیں سمجھتا تو پھر مجھ پر نہ تو غداری کا الزام لگایا جاسکتا ہے نہ حکومت سے بغاوت کا۔

لیکن مقدمہ تو اصل میں ضابطے کی تعمیل اور محض دکھاوا تھا۔ انگریز کسی حال میں بھی اسے زندہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو سیپری (SIPRI) موجودہ شیوپوری (SHIV PURI) کے ایک کھلے میدان میں جو آج کل پولو گراؤنڈ کہلاتا ہے اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ سو برس سے زیادہ ہوجانے پر بھی اس کا نام زندہ ہے اور دور دور سے زائرین اس کی یادگار کی زیارت کے لئے آیا کرتے ہیں۔

بقیہ: جمہوریت میں فرد کی آزادی

اب جمہوریت کی توسیع دو سمتوں میں باقی ہے۔ ایک یہ جس طرح ملک کے کل باشندوں کو بنیادی سیاسی حقوق حاصل ہیں اسی طرح بنیادی معاشی سہولتیں بھی حاصل ہوجائیں۔ اس لئے کہ لوگ سیاسی آزادی کا پورا فائدہ اور پورا لطف اس وقت تک نہیں اٹھا سکتے جب تک انھیں معاشی فراغت نصیب نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جیسے ایک ملک کے باشندے آپس کے جھگڑوں کو بات چیت کے ذریعہ یا پھر عدالت کے فیصلے کے ذریعے طے کرلیا کرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی کرنے لگیں۔ یہ نہ ہو کہ جہاں کسی معاملے میں خصوصاً سرحد کے بارے میں اختلاف ہوا اور فوج لے کر ہمسایہ ملک پر چڑھ دوڑے۔

ہمارے دیش نے آزادی کے بعد جو آئین بنایا ہے وہ جمہوریت کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تصویر پیش کرتا ہے۔ اور فرد کو قانون کے دائرے کے اندر سب سے زیادہ آزادی دیتا ہے۔ اسی لئے ہم اپنی اس اخلاقی دولت کو جمہوریت اور آزادی کے دشمنوں سے بچانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہ آئین ہماری آن ہے اور ہمارے دل کی ہماری روح کی یہ آواز ہے کہ "جان جائے پر آن نہ جائے"۔ (قومی جنگ کا ادبی ناز)

مراسلہ

اصول متعلق اعراب

۸ مارچ ۱۹۶۳ء کے ہماری زبان میں عنوان بالا کے تحت جناب غلام رسول صاحب کا مضمون پڑھا۔ مجھے افسوس ہے کہ موصوف حقائق پر پردہ ڈال کر کسی کی سوجھ بوجھ اور کام کی باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ کا فرمانا ہے کہ راقم الحروف نے ماحول سے متاثر ہو کر صنعت مقطع اور چھ طویل اعرابوں کی تجاویز پیش کی ہے۔ حالانکہ ارادی یا غیر ارادی طور پر ہر شخص ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ آج اردو بھی کافی حد تک ماحول سے متاثر ہو رہی ہے۔ آپ خود بھی ماحول سے متاثر ہو کر ہندی کے ड، ढ، ण اور ञ وغیرہ کا اردو بدل تجویز فرما رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں ہندی اردو اعرابوں میں ربط پیدا کرتا ہوں تو یہ کون سی نئی بات ہو گئی؟

ماحول سے متاثر ہونا بُرا نہیں ہے۔ بُرا تو صرف یہ ہے کہ مسائل کا غلط حل پیش کیا جائے۔ ہر شخص کو اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے تجاویز پیش کرنے اور کسی تجویز پر بھرپور تبصرہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ میں نے تو یہاں تک کہ ملک کے تمام تعلیمی اداروں کو اظہار خیال کی دعوت عام بھی دی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تنقید، تائید یا تجاویز کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔

مگر یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ تجاویز کی مخالفت تو کرتے ہیں لیکن اپنی تجاویز کی تائید یا دوسروں کی تجاویز کی تردید میں معقول دلیل پیش نہیں کرتے۔ صرف ماحول سے متاثر ہونے کا الزام لگانا بے سود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کسی تجویز کا علمی، نظری یا فنی اعتبار سے جائزہ لیا جائے۔ جو بھی ہو اس بار ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ جب تک مسائل کا صحیح حل نہیں نکل جاتا ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ ہمیں اُردو کو زندہ رکھنا ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دینی ہے کہ یہ کم سے کم وقت اور محنت میں سیکھی جا سکے۔ جو لکھی جائے وہی پڑھی جائے، اور ہندی، بنگلہ اور ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں، علاقائی لوک گیتوں اور کہانیوں کو اُردو رسم الخط میں لکھنا ممکن ہو۔

میں اپنی تمام تجاویز پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ میں اپنی تجاویز پر کی گئی ہر تنقید کا معقول جواب بھی دیتا آ رہا ہوں۔ اب تکرار بحث میں اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ جہاں تک اردو میں صنعت مقطع اپنانے کی تجاویز کا تعلق ہے میں واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ ہمارے مروجہ طریقۂ طباعت میں اصلاح ہونی چاہئے۔ اس جوہری دور میں ٹائپ اور چھاپے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو یہ پورا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تصاویر سے آراستہ انگریزی معیار کے اخبار اور رسالے نہیں نکال سکے۔ ہمیں اُردو اخبار پڑھنے سے سیری حاصل نہیں ہوتی چنانچہ مروجہ طریقۂ طباعت میں اصلاح کے لئے میں نے صنعت مقطع کی تجویز پیش کی تھی۔ پھر بھی چونکہ مجھے طباعت کی فنی پیچیدگیوں کا عملی تجربہ نہیں ہے اس لئے میں نے اس کام کو متعلقہ واقف کار حضرات کے سپرد کر دیا ہے شاید کہ اس کا کوئی سہل طریقہ نکل آئے۔

جہاں تک چھ طویل اعرابوں کی تجاویز کا تعلق ہے میں نے اس موضوع پر بھی پچھلے مضامین میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ تلفظ میں قطعیت پیدا کرنے کے لئے ان کا قابل عمل حل نکلنا بہت ضروری ہے۔ آج مروجہ طریقہ کے مطابق "چین" کو चयन (چُنا)، चीन، चैन، चेन اور "چور" کو चवर (کھیت کا میدان)، चूर اور चोर بھی پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز کے مطابق انھیں ترتیب وار چَیَن، چِین، چَین، چین۔ چَوَر، چُور، چور اور چوٗر لکھا جائے گا۔ یقیناً اگر تحریر میں تمام مجوزہ اعرابوں اور علامتوں کی پابندی کی جائے تو تلفظ میں قطعیت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ خارجی اعرابوں پر عمل نہ ہو گا اور اگر عمل نہ ہو گا تو تلفظ میں دقت ہو گی اور اگر عمل ہو گا بھی تو لکھنے کی رفتار کم ہو گی اور تحریر بھی پیچیدگیان ہو گی۔ تعجب ہے آپ اپنی ناقابل عمل تجویز کے بدلے میری ایسی تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں جس میں خارجی اعراب استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ یعنی انھیں ترتیب وار چیین، چیِن، چیں، چیِں، چوَر، چوُر، چور اور چوٗر ('و' کا سر کھلا) لکھا گیا ہے اور 'ی' کے دو نقطوں کو دو نقطوں کی نمائندہ نقطہ نما علامتوں سے ٹھیک اسی طرح ظاہر کیا گیا ہے جس طرح ہم عام تحریر میں دو نقطوں کے بدلے (۰۰ ب) لکھا کرتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے مطالعہ ہو ہماری زبان ۸ فروری اور ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء)

جہاں تک آپ کے اعرابی اصول کا تعلق ہے میں نے تفصیل کے ساتھ آپ کے ہر اصول کو غلط قرار دے دیا ہے۔ پھر بھی آپ کی تازہ دلیل کا حسب ذیل جواب دیا جا رہا ہے:

(۱) آپ مبتدیوں کے لئے اعرابوں کو آوازوں سے اور خواندہ طبقہ کے لئے ناقابل فہم ناموں سے (واؤ معروف، واؤ مجہول، واؤ معدولہ، واؤ لین، یائے معروف، یائے مجہول اور یائے لین) پڑھنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ میں دوہری محنت سے بچنے کے لئے ہر شخص کے لئے انھیں آوازوں سے ہی پڑھنے کی تجویز پیش کر رہا ہوں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ ان دونوں تجاویز میں کون سی تجویز سہل ہے۔

مجھے تعجب ہے کہ ڈھائی سال کی طویل بحث کے بعد آج بھی آپ اُردو میں صرف ا، و، ی کو ہی حروف علت سمجھ رہے ہیں حالانکہ میں نے بارہ حروف علت کی گنتی بتا دی ہے اور بعض نے تو اس کی تعداد چودہ تک پہنچا دی ہے۔ 'ع' کو حرف علت میں نے نہیں بلکہ قدما نے مقرر کیا ہے۔ جب باد، جال، لال میں 'الف' حرف علت ہے تو یقیناً بعد، جعل، اور لعل میں 'ع' بھی حرف علت ہے۔ جب آپ اس قدر واضح بات نہیں سمجھتے تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

(۲) آپ نے نستعلیق، دُنیا، بنیا کو پوری صحت کے ساتھ اسی طرح لکھا ہے۔ میں نے اپنے اصول سے تمام

کر دیا ہے کہ ان میں کسی بھی نقطۂ نظر جزم یا خارجی اعراب نہیں دیں گے۔ (ہماری زبان ۸ فروری) میں تحریر میں کم سے کم خارجی علامتیں دینا چاہتا ہوں تاکہ پوری صحت کے ساتھ ہر شخص اردو لکھ سکے۔ بعد میں آپ نے فرمایا کہ نس، تع اور لیق اگر الگ الگ لکھا جائے تو جزم نہ دیں گے۔ لیکن اگر انہیں ملا کر نستعلیق لکھا جائے تو جزم لازمی طور پر دیں گے۔ لیکن میں بتا چکا ہوں کہ کسی بھی صورت میں نستعلیق پر کوئی علامت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا آپ میرے اصول کو مدنظر رکھ کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ میرا دعویٰ غلط ہے؟ اگر میرا دعوےٰ غلط نہیں ہے تو یقیناً نستعلیق کے بجائے نستعلیق لکھنا زیادہ سہل ہے۔

(۳) تعجب ہے آپ اب بھی واؤ کو پیش کا قائم مقام کہتے ہیں۔ 'و' کبھی व کبھی औ کبھی ऊ پڑھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیش کو 'و' کی ان آوازوں میں سے کسی بھی آواز کا قائم مقام کہنا لسانی اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ ہاں پیش کو 'ی' (مجہول) کا قائم مقام البتہ کہہ سکتے ہیں لیکن 'ی' واؤ کا نہیں بلکہ پیش کا ہندی بدل ہے۔

(۴) تشدید، جزم اور نیمہ کو آپ اعراب کہتے ہیں۔ اگر میں آپ کے اصول سے ہی آپ کے اس دعویٰ کی تردید کروں تو بہتر ہوگا۔ آپ کا کہنا ہے کہ اعراب کو آواز اور نام دونوں سے پڑھا جائے گا تو پھر بتائیں کہ اگر تشدید، جزم اور نیمہ اعراب ہیں تو آواز سے انھیں کس طرح پڑھا جائے گا؟ اللہ کے لئے ضد نہ کیجئے۔ اردو کے اعرابوں اور علامتوں کو غلط ملط کر کے معمہ نہ بنائیے۔ اردو کو ایک قابلِ فہم زبان بننے دیجئے۔ تشدید، جزم اور نیمہ اعراب نہیں بلکہ علامتیں ہیں۔ ان میں کسی طرح کی آواز نہیں ہے لیکن اعراب میں آواز ہوتی ہے۔ اعراب سے مراد ہندی کی ماترائیں ہیں۔ پھر بھی اگر آپ مطمئن نہیں ہیں تو آئندہ کسی ایک ہی عنوان کو بحث کا موضوع بنائیے، انشاء اللہ آپ کو کامل طور پر اطمینان ہو جائے گا۔

نیمہ کے متعلق میں نے اپنے طور پر آج تک کچھ نہیں کہا ہے ہاں البتہ اس کی تفصیل پیش کرنے کا وعدہ ضرور کیا ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ لیکن سردست آپ کی دوسری تفصیل تک اس کو ملتوی کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے نیمے کی تعریف اور موقع استعمال کو گڈمڈ نہیں کیا ہے بلکہ سکتین میں آپ کی تعریف کو ہی لکھ دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے نیمے کی تازہ تفصیل پیش کر دی۔ اب گڈمڈ کرنے کا دوسروں پر الزام نہ دیگا۔ میں نیمہ کے متعلق آپ کے نئے دعویٰ پر حسب ذیل مختصر تبصرہ پیش کر رہا ہوں:

(۱) آپ کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ نیمہ (سکون) سے حرف کی مدھم آواز ظاہر ہوتی ہے۔ دراصل نیمہ سے حروف کی حقیقی آواز ظاہر ہوتی ہے۔ جس حرف پر نیمہ دیتے ہیں اس پر اعراب کی فاضل آواز نہیں ملی ہوتی۔ یعنی اس حرف میں اُس کی اپنی خالصتاً آواز رہتی ہے۔

(۲) نیمہ کا استعمال اُردو میں صرف نون غنہ اور یائے مخلوطی کے درمیان ہی نہیں ہوگا بلکہ عام طور پر ہوگا۔ اگر نہیں تو مثالیں دے کر سمجھائیں۔

(۳) اس کا استعمال ہندی اور سنسکرت کے سیلٹ کی صورت میں ہمیشہ نہیں ہوگا جیسے दिल्ली میں سکون استعمال نہیں ہوگا۔

(۴) نیمہ کا استعمال انگریزی میں صرف 'S' سے شروع ہونے والے الفاظ میں نہیں بلکہ ہر حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ الفاظ کے شروع، درمیان اور بعد میں بھی آ سکتا ہے۔ غور کیجئے آپ کی ایک تعریف بھی صحیح نہیں نکلی۔

اعراب جیسے پیچیدہ اور خشک موضوع پر لکھنے والوں کو کافی سر کھپانا پڑتا ہے۔ ادبی مضامین لکھنا آسان ہے۔ مگر اعراب جیسے پیچیدہ مباحث پر مضمون لکھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس بحث میں حصہ لینے والوں نے مسائل پر کافی سوچا ہوگا۔ بلاشک و شبہ انفرادی تجاویز کے لئے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد ملی ہے۔ اس مسئلے پر سر جوڑ کر اور کندھے ملا کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے کہ بحث میں تلخی پیدا ہو رہی ہے۔ اگر بحث کا یہی انداز رہا تو مسائل کا حل نہیں نکل سکتا۔ ابھی ہمیں اردو پرائمر، اردو کس طرح پڑھائیں، الفاظ کا ہجے، انگریزی اور ہندی الفاظ کا ہجے، انگریزی اور ہندی الفاظ کا تلفظ اور مروجہ اردو قواعد وغیرہ مباحث کو بحث و نظر کا موضوع بنانا ہے۔ میں کمیٹی سے عرض کروں گا کہ وہ علی گڑھ یا دلّی میں ایک سیمینار منعقد کرے، مجوز کو شرکت کی دعوت دے تاکہ نقشوں اور چارٹوں کے ذریعے پیچیدہ باتوں کو روبرو سمجھایا جا سکے۔ ورنہ تجاویز سمجھنے میں غلط فہمیاں ہوں گی اور ہم کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ میں کمیٹی سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ اپنی رپورٹ میں تمام تجاویز کا حوالہ دے تاکہ آنے والی نسلیں مختلف تجاویز کا تقابلی مطالعہ کر سکیں۔ اس بحث کے لئے ملک کے کثیر الاشاعت اخبار اور رسالوں کا تعاون حاصل کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ تجاویز سامنے آئیں اور اس تحریک کی خاطر خواہ تبلیغ ہو سکے۔ (ایم۔ اے۔ حسن پھلواروی)

معاصر

مولانا آزاد اور ہندی

(ڈاکٹر تاراچند کا ایک خط)

بمبئی پردیش راشٹر بھاشا کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مسٹر این وی گڈگل نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں حسب ذیل باتیں کہیں:

"حالانکہ مولانا آزاد ایک اسکالر ایڈمنسٹریٹر اور ماہر تعلیم تھے لیکن ہندی سے انھیں وہ گہرا پیار نہیں تھا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح مرکزی حکومت میں ایک ایسی فضا تیار ہوئی جس میں نتیجۃً ہندی حقیقی ترقی نہیں کرسکی اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہندی انتظامیہ کی زبان بن چکی ہوتی۔"

ملک کے باخبر حلقوں میں اس بیان کو پسند نہیں کیا گیا۔ ہم یہاں ڈاکٹر تاراچند کا ایک خط "ٹائمز آف انڈیا" مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۶۳ء کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جس سے حقائق کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر تاراچند مولانا کی وزارت تعلیم کے زمانے میں مارچ ۱۹۴۸ء سے دسمبر ۱۹۵۱ء تک سکریٹری کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ اسی مدت میں وزارت تعلیم نے ہندی کے لئے کیا کچھ کیا ہے اس سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے ناقابل تردید حقائق پیش کئے ہیں۔

"سائنس، ہیومینٹیز و قانون کے تمام موضوعات اور انتظامیہ کے لئے ہندی اصطلاحیں تیار کرنے کے لئے ملک کے بہت معروف سائنس دانوں اور ماہرین لسانیات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں ایک ماہر علم اللسان کی زیر صدارت نیا شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ کے تحت کل وقتی معاونین اور ماہرین کی سب کمیٹیاں مقرر کیں جن کے فرائض۔ اصطلاحات کی فہرست تیار کرنا، جانچ پڑتال کرنا اور پھر منظور اختیار کرنا تھا۔ ان کے سپرد ایک ایسا عظیم کام کیا گیا تھا جس میں بے پناہ دشواریاں بھی تھیں لیکن اس ضمن میں کسی بھی کوشش یا اخراجات کے سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ اس طرح ایک لاکھ اصطلاحات اختراع کی گئیں۔

"انگریزی اور ہندی کے ایک کامل جامع لغت کے پرچار کے سلسلے میں بہت سی انجمنوں کو مالی امداد دی گئی۔ ہندی کے فروغ کے لئے پردیشوں اور متعلقہ انجمنوں کے درمیان کئی لاکھ روپے تقسیم کئے گئے ان انجمنوں میں ناگری پرچارنی سبھا، ہندی ساہتیہ سمیلن اور ہندوستانی پرچار سبھا کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

"دس جلدوں پر مشتمل ہندی انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا کام ناگری پرچارنی سبھا کے سپرد کیا گیا تھا اور الٰہ آباد یونیورسٹی نے ہندی کی بلند معیاری کتب کا نظر ثانی شدہ اور باشرح ایڈیشن شائع کرنے کا فرض قبول کیا تھا۔

"انفرادی طور پر بھی ہندی کے ادیبوں کی ہمت افزائی کی گئی انھیں سائنسی و تکنیکی موضوعات پر کتابیں لکھنے اور ہندی کتب کی ترتیب و تدوین کے لئے مالی امداد بھی دی گئی۔ ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں سستی کتابیں شائع کرنے کی غرض سے ۱۹۵۷ء میں نیشنل بک ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بلند پایہ تخلیقی ادب کے لئے ساہتیہ اکادمی کی تنظیم کی گئی اور ان تمام کاموں میں ربط پیدا کرنے کے لئے مرکزی ہندی ڈائرکٹوریٹ بنایا گیا۔

"ہندی کی بہتری اور فروغ کے لئے مولانا کی وزارت تعلیم نے اور بھی کئی قابل تعریف کام انجام دئیے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

"ہندی سکشا سمتی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس کے تحت غیر ہندی والے علاقوں کے طلبہ کو ہندی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

"دو ہزار الفاظ پر مبنی بنیادی ہندی لغت اور ہندی میں کم سے کم تعلیم کے معیار کے لئے دس ہزار الفاظ کی فہرست تیار کرنے کے لئے سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔

"غیر ہندی پردیشوں کو ہندی کی ترقی و تعلیم پر عمل درآمد کے لئے امداد مقرر کی گئی۔

"ہندی کی بنیادی قواعد اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں ہندی کے مشترک الفاظ کی تقابلی لسانی فہرست مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

"ہندی ٹائپ رائٹر کے لئے معیاری کی "بورڈ" کی تیاری کے کام کی ابتدا کرائی گئی۔

"مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کا معیاری نظام مرتب کرنے کے لئے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی ساخت و ماہیت کا تجزیہ اور دوسری زبانوں کی مشہور تخلیقات کا ہندی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوا۔

"مرکزی سکریٹریٹ کے ملازمین کے لئے ہندی پڑھنے کی آسانیاں دینا منظور کیا گیا۔

"غیر ہندی علاقوں میں ہندی اساتذہ کی ٹریننگ کے منصوبوں کی امداد و اشتراک اور ان علاقوں کی یونیورسٹیوں کی ہندی کی تعلیم کے لئے ہمت افزائی کی سفارشات کو بھی قبول کرلیا گیا۔

"جہاں تک ہندی کے پرچار کے لئے مولانا کی ذاتی خدمات کا تعلق ہے دو حقائق کا بیان خاص طور پر کیا جاسکتا ہے مولانا عربی اور فارسی کے اسکالر تھے اسکی ابتدائی تحریریں اور تقریریں انہی زبانوں کے بوجھ سے لدی ہوتی تھیں لیکن وزارت تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہی انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں آسان الفاظ استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ہندی اور اردو کے درمیان طرز بیان (اسٹائل) کا فرق ہے اس لئے انھوں نے وہ انداز بیان اختیار کیا جسے عام آدمی بھی سمجھ لیتا ہے۔ پرائیویٹ گفتگو اور پبلک جلسوں میں وہ ہندی کے حصول پر مستقل زور دیتے تھے۔

"اپنی موت سے چند دن پہلے ۱۹۵۸ء میں کل ہند اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے سامعین (جن میں اکثریت اردو شعرا اور ادیبوں کی تھی) پر زور دیا کہ وہ ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کو پڑھیں اور اس کی قدر کریں۔ اس لئے بھی کہ ہندی اور اردو میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ ان دونوں ہی کو آئین میں قومی زبان کا مرتبہ ملا ہے۔

"انگریزی کی جگہ ہندی کے استعمال میں تاخیر کے اسباب پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ لیکن مذکورہ حقائق کے ہوتے ہوئے کوئی بھی ایماندار اور وضع دار انسان مولانا آزاد پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کرسکتا۔"

(عوامی دور)

بی۔ چندرا

جوزف پُلٹزر۔ امریکی صحافت کا باوا آدم

امریکی صحافت میں جوزف پُلٹزر کا وہی مقام ہے، جو ہنری فورڈ کو موٹر سازی کی صنعت میں حاصل ہے۔ فورڈ نے کلرکوں اور کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں تک کے لئے سستی اور تیز رفتار موٹر کاریں تیار کیں۔ پلٹزر نے دو پنس کے اخباری ایڈیشن شایع کئے جنھیں ریستورانوں میں کام کرنے والے بیرے اور ٹیکسی ڈرائیور تک خریدتے تھے۔ فورڈ کی طرح پلٹزر نے بھی چھوٹے پیمانے اور نچلی سطح سے کام شروع کیا۔

وہ بوڈاپسٹ (ہنگری) میں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا اور امریکی ساحلوں پر ناجائز طور پر آ پہنچا۔ اس ۱۷ سالہ نوجوان کو اگرچہ آرام و آسائش میسر نہ تھی، تاہم زندگی میں کامیابی کے لئے جس استقلال، لگن اور ذوق و شوق کی ضرورت ہے وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس نے اپنے وطن میں امریکہ کے متعلق دو باتیں پڑھی تھیں۔ ایک یہ کہ سوجھ بوجھ رکھنے والے کے لئے مواقع میسر آنے کی حقیقی سرزمین امریکہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں غلامی کے خاتمے کے لئے خانہ جنگی جاری ہے۔ چنانچہ نیویارک پہنچتے ہی لنکن کی رہنمائی میں وہ ایک سالے کی رجمنٹ میں شامل ہو گیا۔ فوج سے الگ ہونے کے بعد سال بھر کے لئے سینٹ لوئیس میں خچروں کے سائیس، بوائلر کی بھٹی چلانے والے اور دریائی کشتیوں کے قلی کے طور پر کام کرنے کے علاوہ فالتو وقت میں وہ قانون کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ ایک دن شطرنج کھیلتے ہوئے ایک مقامی اخبار کے ناشر سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے رپورٹر کے طور پر اس کی خدمات حاصل کیں اور اس طرح ایک عظیم امریکی ایڈیٹر کی افسانوی زندگی کا آغاز ہوا۔

پلٹزر نے اپنا مقام بڑی جلدی پیدا کر لیا۔ اس نے اپنے اس نئے کام کو محض روزگار کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنا پیشہ سمجھا وہ روزانہ بیس بیس گھنٹے کام کرتا اور شہر کی سرایوں، ہوٹلوں، شراب خانوں، جوئے خانوں اور شہر کی کونسلوں میں گھومتا اور لوگوں کی گپ بازیوں، بدنامیوں، عہدوں کے ناجائز فائدوں، رشوتوں اور دوسری ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف آنکھیں اور کان لگائے رکھتا جو لوگوں کی روزانہ کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ سال بھر کے بعد مقامی ری پبلکن پارٹی نے اسے مسوری کی ریاستی اسمبلی کی رکنیت کے لئے ٹکٹ دیا جس نے بھاری اکثریت سے اسے کامیاب کر دیا۔

۱۸۷۸ء میں اس کے لئے ایک عظیم موقع آیا۔ اس نے ایک گرتا ہوا اخبار "سینٹ لوئیس ڈسپیچ" خریدا اسے "سینٹ لوئیس پوسٹ" کے ساتھ ملا دیا، جو جلد ہی حقیقی معنوں میں امریکہ کا ایک عظیم اخبار بن گیا۔ اس کا پہلا پرچہ گویا کہ کسی بجلی کی لپک تھا۔ اس نے امیر آدمیوں، کارپوریشنوں اور تجارتی اداروں کی طرف سے ٹیکسوں کی ادائگی ٹالنے کے مختلف ہتھکنڈوں کی قلعی کھول کر رکھ دی اور جوئے بازی اور دوسرے عیوب اور برائیوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ اخبار کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور جلد ہی بھاری منافع ہونے لگا۔ ۱۸۸۳ء میں اس نے نیویارک کا رُخ کیا، اور وہاں بھی ایک ڈوبتا ہوا اخبار "نیویارک ورلڈ" خرید لیا۔

جب "ورلڈ" پلٹزر کے ہاتھ میں چلا گیا تو پہلے ہی تین مہینوں میں اس کی روزانہ اشاعت ۲۲۷۶۱ سے بڑھ کر ۳۹ ہزار ہو گئی۔ سال کے آخر میں اس کی اشاعت شہر کے بڑے بڑے اخبار کی اشاعت کے برابر ہو گئی اور اس سے اگلے برس اس کی اشاعت ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی۔

پلٹزر نے تازہ خبریں بہم پہنچانے کے لئے صبح اور شام کے الگ الگ دو ایڈیشن جاری کئے۔ اس کے علاوہ ایک خاص ضمیمہ "سنڈے ورلڈ" بھی شایع کرنا شروع کیا۔ یہ امریکہ کا پہلا اخبار تھا جس نے ایک خاتون نامہ نگار نیلی بالائی کو ملازم رکھا۔ نیویارک کے قریب بلیک ویل جزیرہ میں ایک پاگل خانے کے اندرونی حالات براہِ راست معلوم کرنے کے لئے اس مہم جو نامہ نگار نے اتنی کامیابی سے پاگل پن کا مظاہرہ کیا کہ اسے ایک مہینہ تک وہاں رکھے جانے کا حکم دیا گیا۔ اس کے انکشافات سے ساری قوم غضب ناک ہو گئی۔

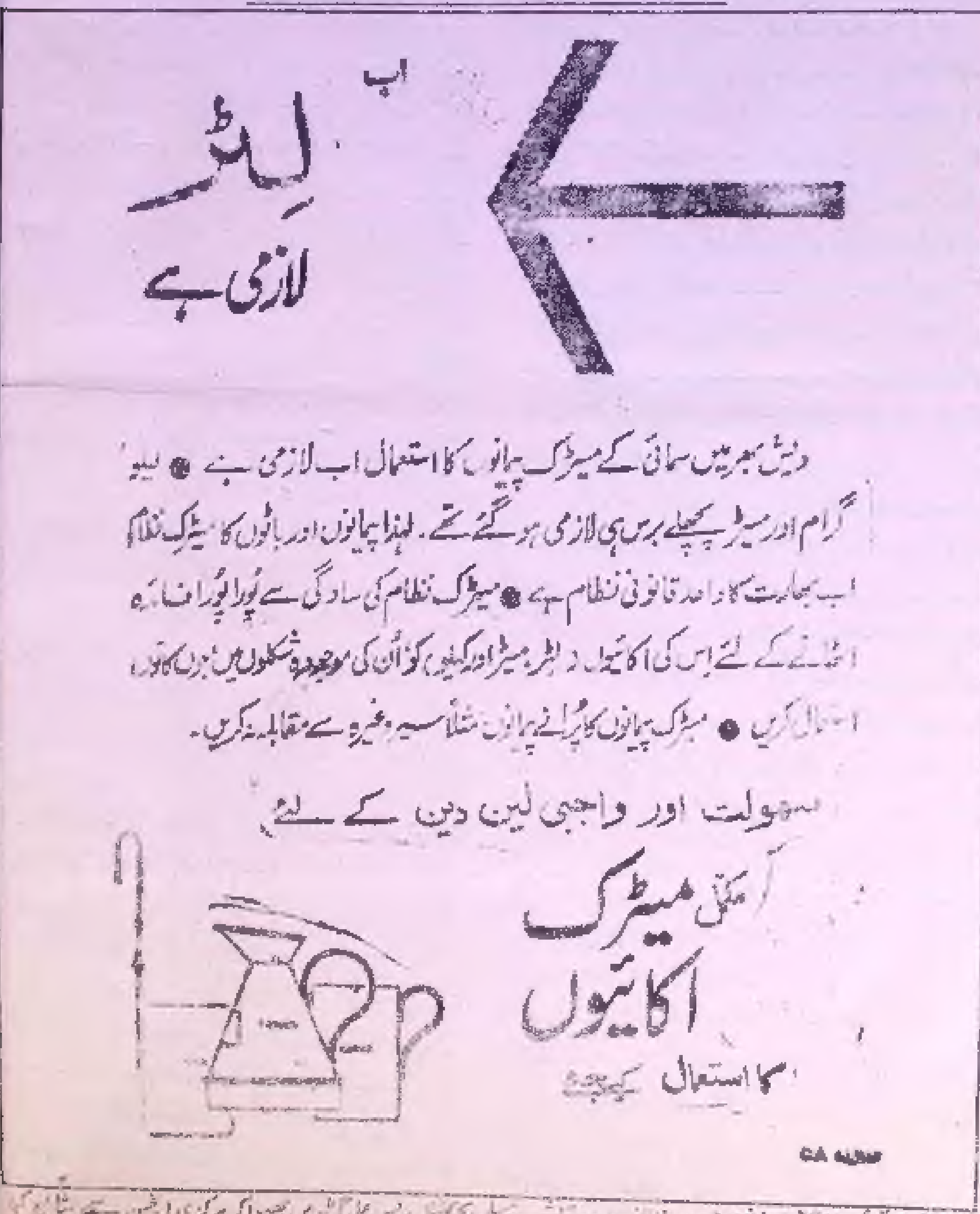
پلٹزر محض ایک کامیاب تاجر ہی نہیں تھا اس نے اس بات کو اپنا مقصد بنایا کہ امریکہ کا آزادی اور مساوات کا پیغام عوام کے ادنیٰ ترین طبقوں تک پہنچایا جائے۔ اس نے جب یہ سنا کہ فرانسیسی عوام نے اپنے ۱۷۹۳ء کے انقلاب کی کامیابی میں امریکہ کی روحانی امداد کی قدر کرتے ہوئے دس لاکھ فرانک جمع کئے ہیں اور سنگ تراش اگسٹی بارتھولڈی سے کہا ہے کہ وہ امریکی عوام کو ان کی دوستی کے تحفہ کے طور پر دینے کے لئے آزادی کا مجسمہ بنائیں۔ پلٹزر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایسا بیش بہا تحفہ امریکی حکومت کو فرانسیسی عوام سے نہیں بلکہ امریکی عوام سے موصول ہونا چاہیے۔ چنانچہ "ورلڈ" نے ایک لاکھ ڈالر جمع کرنے کی مہم شروع کر دی۔ جلد ہی دکانوں اور دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں، اسکولوں، دفتروں اور کارخانوں کے مزدوروں نے چھوٹے چھوٹے عطیے دینے شروع کئے۔ اور اگست ۱۸۸۵ء کو یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ ۲۸ر اکتوبر کو آزادی کی دیوی کا مجسمہ جس کے قد کی بلندی ۱۵۱ فٹ تھی نصب کر دیا گیا۔ نیویارک کی بندرگاہ میں داخل ہونے والا ہر جہاز ابھی تک سب سے پہلے اسی مجسمے سے متعارف ہوتا ہے۔

پلٹزر قسم کے اخبارات کو ۲۲ سال تک چلانے سے؟

مسلسل بوجھ اور تناؤ پیدا ہوتا ہے اس سے فولادی نسیں بھی ٹوٹ سکتی ہیں، چنانچہ پولٹزر کا اعصابی نظام بالکل تباہ ہو گیا جوانی کے عالم ہی میں اس کی بینائی جاتی رہی، اور اس کی نسیں اس قدر تنی رہتی تھیں کہ تھوڑا سا درد بھی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا چنانچہ اس نے سمندر میں ایک کشتی پر اپنی زندگی کے آخری ۲۴ برس گزارے۔ بالآخر ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

پلٹزر اپنی موت کے بعد بھی اسی طرح عظیم رہا جس طرح زندگی میں تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ صرف ایک قابل، بے لاگ اور بے لاگ جذبہ رکھنے والا اخبار ہی جسے صحیح بات جاننے کی فہم اور اسے انجام دینے کی جرأت ہو مفاد عامہ کی حفاظت کر سکتا ہے، اور جس کے بغیر عوامی حکومت ایک دکھاوا اور مذاق ہے، اس نے کولمبیا یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ ڈالر چھوڑے تاکہ وہاں جرنلزم کا ایک اسکول قائم کیا جائے۔ یہ اسکول آج امریکہ میں اپنی قسم کا بہترین اسکول ہے اس نے جرنلزم، علم و ادب، سنگیت اور فنون میں ممتاز مقام حاصل کرنے والوں کے لئے بھی سالانہ انعامات قائم کئے جو امریکہ میں مرغوب ترین انعامات تصور کئے جاتے ہیں اور ان کا مقصد خدمت عامہ، عوامی اخلاق، امریکی ادب اور تعلیمی ترقی کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

جرنلزم میں ان انعامات کو پانے والی بعض ممتاز ہستیوں کے نام ہیں۔ والٹر لپ مین، جیمز ریسٹن، رلیف میک گل اور کارل رودان۔ علم و ادب میں انعامات حاصل کرنے والوں میں ارنسٹ ہیمنگوے، یوجین اونیل، پرل بک، سنکلیر لیوس، ولیم فاکنر، جان سٹین بک، اپٹون سنکلیر، رابرٹ ای، شیروڈ، جیمز مچنر، ٹینیسی ولیمز اور آر تھر ملر کے نام قابل ذکر ہیں۔



مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسین، پرنٹر شیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا